تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل

(۶)

نکتۂ ہشتم و نہم | اب مجھے اس قرارداد کے صرف آخری دو نکات پر بحث کرنی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ ہم انتخابات سے بے تعلق بہر حال نہیں رہ سکتے، خواہ ان میں بلاواسطہ حصہ لیں یا بالواسطہ یا دونوں طرح، البتہ یہ امر کہ ہمیں کس وقت کس طرح، یا کس کس طرح ان میں حصہ لینا ہے، جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ ہر انتخاب کے موقع پر حالات کا جائزہ لے کر اس کا فیصلہ کرے۔

اس معاملے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے تین حقیقتیں واضح طور پر آپ کی نگاہ میں رہنی چاہئیں:-

پہلی یہ کہ آپ اس ملک میں اسلامی نظامِ زندگی عملاً قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے قیادت کی تبدیلی ناگزیر ہے۔

دوسری یہ کہ آپ جس ملک میں کام کر رہے ہیں وہاں ایک آئینی و جمہوری نظام قائم ہے اور اس نظام میں قیادت کی تبدیلی کا ایک ہی آئینی راستہ ہے ــــ انتخابات

تیسری یہ کہ ایک آئینی و جمہوری نظام میں رہتے ہوئے تبدیلیٔ قیادت کے لیے کوئی غیر آئینی راستہ اختیار کرنا شرعاً آپ کے لیے جائز نہیں ہے، اور اسی بنا پر آپ کی جماعت کے دستور نے آپ کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ آپ اپنے پیشِ نظر اصلاح و انقلاب کے لیے آئینی و جمہوری طریقوں ہی سے کام کریں۔

ان تین حقیقتوں کو ملا کر جب آپ غور کریں گے تو بالکل منطقی طور پر ان سے وہی نتیجہ نکلے گا جو قرارداد میں بیان کیا گیا ہے۔ آپ انتخابات میں آج حصہ لیں یا دس، بیس، پچاس

برس بعد، بہرحال، اگر آپ کو یہاں کبھی اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنا ہے تو راستہ آپ کو انتخابات ہی کا اختیار کرنا پڑے گا۔

اس کے ساتھ اگر یہ حقیقت بھی آپ کی نگاہ میں رہے کہ جس ملک میں آئینی و جمہوری نظام کارفرما ہو، اور جہاں مختلف نظریات و مقاصد کے لیے کام کرنے والی طاقتیں بھی اپنا اپنا کام کر رہی ہوں، اور جہاں پہلے سے ایک طرزِ خاص کی قیادت اپنی جڑیں جمائے ہوئے ہو، وہاں ایک نئی قیادت کا اُبھرنا کبھی یک لخت نہیں ہو سکتا بلکہ وہاں یہ تبدیلی لازماً بتدریج ہی ہو گی، تو آپ کو یہ ماننے میں کوئی تامل نہ رہے گا کہ اس تدریجی عمل کو آج ہی سے شروع ہونا چاہیے۔ اس کی ابتدا آپ آج سے کریں تو دس بیس سال میں آخری منزل آپ کے سامنے ہو گی دس بیس سال بعد کریں تو اس کی تکمیل کے لیے آپ کو دس بیس ہی سال اور انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ امید کرنا غلط ہے کہ کسی وقت بھی آپ اس پوزیشن میں ہونگے کہ انتخابات کے میدان میں اترتے ہی آپ کا پہلا قدم آخری منزل پر پڑے۔ لہٰذا دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ جو کام آپ کو کسی نہ کسی وقت کرنا ہے اور اپنے نصب العین تک پہنچنے کے لیے جسے کیے بغیر چارہ نہیں ہے، اسے آپ پہلا موقع ملتے ہی شروع کر دیں اور ہر بعد کے موقع اپنے پچھلے کام سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

وجوہِ اختلاف اور ان کی کمزوریاں | اس کے جواب میں جو باتیں کہی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ موجودہ بگڑے ہوئے معاشرے میں انتخابات کے ذریعہ سے تبدیلیِ قیادت کی کوشش کرنا گھوڑے کے آگے گاڑی باندھنا ہے۔ آپ کو پہلے معاشرے کی اصلاح کرنی چاہیے تاکہ اس میں صالح نظام کی پیاس اور صالح لوگوں کی طلب اور ان کو تلاش کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو گا کہ انتخابات میں ایسے لوگ کامیاب ہوں جو اسلامی نظامِ زندگی برپا کرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں اور برسرِ اقتدار آ کر وہ اس مقصد کے لیے عملاً کچھ کر بھی سکیں۔ ورنہ اگر معاشرہ یہی رہے جس کے بگاڑ کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں، تو محض انتخابات

کے ذریعہ سے ایک صالح قیادت کا اُبھر آنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اس لیے صحیح ترتیب کار یہ ہے کہ ہم ایک مدت تک انتخاب کے میدان میں اترنے سے پرہیز کریں، اور اپنی تمام مساعی صرف اصلاح معاشرہ کے لیے وقف رکھیں۔ پھر جب یہ اطمینان ہو جائے کہ معاشرے میں ایک صالح قیادت کی مانگ اور اسے اُبھارنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہے، تب انتخابات میں حصہ لیں، کیونکہ وہی اس کا صحیح وقت ہو گا۔

بظاہر یہ بات بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کا تجزیہ کر کے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ اس کی ساری بنیاد چند غلط مفروضات پر رکھی گئی ہے، اور پھر ان مفروضات سے ایک غلط نتیجہ نکال کر جو ترتیب کار تجویز کی گئی ہے وہ عقلی اور عملی دونوں پہلوؤں سے نہایت خام ہے۔

غلط مفروضات | پہلی غلط بات جو اس میں فرض کی گئی ہے، یہ ہے کہ یہاں کوئی شخص اصلاح معاشرہ کا کام چھوڑ کر صرف انتخابات کے ذریعہ سے تبدیلی قیادت کی کوشش کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات امر واقعہ کے خلاف ہے۔ ہم جس لائحہ عمل پر برسوں سے کام کر رہے ہیں، اور اب اِس پورے کام کی جو اسکیم آپ کے سامنے رکھی گئی ہے، اس کے چار میں سے تین اجزاء اصلاح معاشرہ ہی کی تدابیر پر مشتمل ہیں۔ یہ ہمارا دائمی پروگرام ہے جس پر ہمیں سال کے تین سو پینسٹھ دن کام کرنا ہے، خواہ انتخابات ہوں یا نہ ہوں۔ اس لیے یہاں اصل بحث یہ نہیں ہے کہ آیا تبدیلی قیادت کے لیے اصلاح معاشرہ کا کام کیا جائے یا صرف انتخاب لڑے جائیں۔ بلکہ بحث دراصل یہ ہے کہ آیا اصلاح معاشرہ کی یہ ساری کوشش جاری رکھنے کے ساتھ انتخابات میں بھی حصہ لیا جائے یا نہیں۔ ہماری اسکیم یہ ہے کہ یہ دونوں کام ایک ساتھ ہونے چاہئیں۔ اب جو شخص یہ رائے رکھتا ہو کہ ان میں سے صرف ایک کام ہونا چاہیے اور دوسرا نہ ہونا چاہیے، وہ اپنی اس رائے کے حق میں معقول دلیل لائے۔ اسے بتانا چاہیے کہ صرف اصلاح معاشرہ ہی کے کام پر کیوں اکتفا

کیا جائے، اور انتخابات کے موقع پر اس کام کے نتائج کا فائدہ اٹھانے سے کیوں گریز کیا جائے؟

دوسری غلط بات اس میں یہ فرض کی گئی ہے کہ انتخاب صرف ووٹ لینے اور دینے کا کام ہے، معاشرے کے بناؤ اور بگاڑ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ دراصل معاشرے کو بنانے اور بگاڑنے میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے، اور کوئی ایسا شخص جو "اصلاحِ معاشرہ" کا محض لفظ ہی نہیں بلکہ اس کے معنی بھی جانتا ہو، اُن اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو انتخابات سے معاشرے پر پڑتے ہیں خصوصیت کے ساتھ جس ملک کے نظامِ انتخابات میں رائے دہندگیِ بالغان کا اصول رائج ہو، وہاں تو ووٹر اور معاشرہ درحقیقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ کیونکہ معاشرے کا ہر بالغ شخص اس میں ووٹر ہوتا ہے۔ اِن ووٹروں سے اگر روپے کے عوض ووٹ خریدے جائیں، یا طرح طرح کے دباؤ ڈال کر یا لالچ دے کر ان کے ووٹ حاصل کیے جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے گرد و پیش ایک ضمیر فروش، لالچی اور ڈَرپوک معاشرہ تیار ہو رہا ہے، اور ساتھ کے ساتھ اسی معاشرے میں آوارہ لاؤں غنڈوں اور بدکردار طالبینِ اقتدار کی تربیت بھی ہو رہی ہے جو اپنی قوم کی اِن اخلاقی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے ہوں۔ دوسری طرف اگر ان ووٹروں سے برادریوں اور قبیلوں اور صوبوں کے نام پر بھی ووٹ لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے معاشرے کو تنگ نظری جاہلانہ تعصبات اور افتراق و انتشار کی تربیت بھی دی جارہی ہے، اور اس کے ساتھ آپ ہی کی قوم کے کچھ ذہین اور بااثر عناصر کو یہ تعلیم مل رہی ہے کہ اپنی ذاتی ترقی کے لیے وہ یہ ہتھکنڈے بھی استعمال کریں۔ تیسری طرف اگر ان ووٹروں سے روٹی اور کپڑے کے نام پر، معاشی مفادات کے نام پر، یا کچھ دوسرے لادینی اصولوں اور نظریات کی تبلیغ کر کے بھی ووٹ لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے پورے معاشرے کو، اس کے ایک ایک بالغ مرد اور عورت کو، مادہ پرستی، دنیا پرستی، اور لادینی نظریۂ حیات کے حق میں رائے دینے کے لیے بھی تیار کیا جارہا ہے۔

انتخابات میں یہ تینوں قسم کے عناصر معاشرے کے اندر سے اپنا اپنا حصہ لے لیں گے اور انتخابات کا نتیجہ ٹھیک ناپ تول کر آپ کو بتادے گا کہ ان میں سے ہر ایک نے اس کو کس قدر بگاڑنے

میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اِن عناصر کو اس تخریبِ معاشرہ کے لیے کھلی چھٹی دے دینا اور یہ کہنا کہ ہم تو انتخابات کو چھوڑ کر صرف اصلاحِ معاشرہ کریں گے، آخر کیا معنی رکھتا ہے؟

پھر اصلاحِ معاشرہ سے اگر آپ کی مراد معاشرے کو اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لیے تیار کرنا ہے تو ووٹر کو صحیح انتخاب کے لیے تیار کرنا اُس کے دائرۂ عمل سے خارج کیسے ہو سکتا ہے؟ اور یہ کام کیے بغیر کس طرح ممکن ہے کہ آپ کا معاشرہ کبھی فاسد قیادتوں کو ہٹا کر کوئی صالح قیادت برپا کرنے کے قابل ہو سکے؟ آپ کو اس کے لیے ووٹر کی اخلاقی قدریں بدلنی ہونگی۔ اسے اسلامی نظام سے روشناس کرانا ہوگا۔ اس میں اسلامی نظام کی طلب پیدا کرنی ہوگی۔ اس کو صالح اور غیر صالح کی تمیز دینی ہوگی۔ اس کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ اس ملک کی بھلائی اور برائی کا ذمہ دار براہ راست وہ خود ہے۔ اس میں اتنی اخلاقی طاقت اور سمجھ بوجھ پیدا کرنی ہوگی کہ نہ دھن کے عوض اپنا ووٹ بیچے، نہ دھونس میں آکر اپنے ضمیر کے خلاف کسی کو ووٹ دے، نہ دھوکا دینے والوں کے دھوکے میں آئے، اور نہ دھاندلیوں سے بددل ہو کر گھر بیٹھ رہے۔ یہی کام تو ہم انتخابات میں حصّہ لے کر کرنا چاہتے ہیں[1]۔ کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ اصلاحِ معاشرہ کا کام نہیں ہے؟ اور کیا کسی دانشمند کا یہ خیال ہے کہ اپنے ملک کے ووٹروں کو اس حیثیت سے تیار کیے بغیر یہاں کبھی انقلابِ قیادت ہو سکے گا؟ انتخابات سے الگ رہ کر آپ معاشرے کی اصلاح کے لیے جو تدبیریں اختیار کریں گے وہ لوگوں کے عقائد، طرزِ فکر، اخلاق عادات اور معاملات کو دوسرے تمام پہلوؤں سے تو ضرور سنوار سکیں گی، مگر ان کے ذہن اور اخلاق کا یہ خاص پہلو کہ وہ اپنے ملک کی زمامِ اقتدار کس کو سونپنا پسند کرتے ہیں، اور فاسد قیادتوں کے مقابلے میں صالح قیادت کو اوپر لانے کے لیے کتنے عزم و جزم سے کام لیتے ہیں، اِس کی اصلاح و تربیت انتخابات کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں کی جا سکتی، اور ظاہر ہے کہ انقلابِ قیادت

[1] یہی کام ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں حصہ لینے کے وقت ہمارے پیشِ نظر تھا۔ جماعت نے جو منشور اُس وقت شائع کیا تھا اُس میں صفحہ ۸ سے ۹ تک اسی مقصد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

کے معاملے میں فیصلہ کن چیز افرادِ معاشرہ کے ذہن و اخلاق کا یہی پہلو ہے۔

تیسری ایک غلط بات اس تجویز میں اور بھی فرض کی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم انتخابات سے الگ اصلاح معاشرہ کا کام کرتے ہوئے کسی خاص مرحلے پر پہنچ کر بآسانی یہ معلوم کریں گے کہ اب ہمارے معاشرے میں صالح قیادت برپا کرنے کی خواہش اور صلاحیت پیدا ہو چکی ہے، اور اس علم کی بنا پر اطمینان کے ساتھ یہ فیصلہ بھی کر سکیں گے کہ انتخابات میں حصہ لینے کا صحیح وقت آگیا ہے۔ میرے نزدیک یہ محض ایک خوش فہمی ہے جو معاملات کو نہایت سطحی نظر سے دیکھنے کی وجہ سے بعض لوگوں کو لاحق ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کا نمازی، پرہیزگار، صحیح العقیدہ، دیندار اور اصلاح پسند ہو جانا اور چیز ہے، اور ان کا عملاً اس ارادے میں مضبوط ہو جانا کہ وہ فیصلے کے وقت ہر تعصب ہر لالچ، ہر خوف، اور ہر فریب سے غیر متاثر رہ کر اپنا وزن اسلامی نظام کے پلڑے میں ڈالیں گے، بالکل ہی ایک دوسری چیز۔ پہلی نوعیت کی عام اصلاح آپ جتنی چاہیں اور جتنے بڑے پیمانے پر چاہیں کرتے رہیں، مگر یہ بات کہ فی الواقع کتنے لوگوں نے اس فیصلہ کن حد تک اصلاح قبول کی ہے، صرف فیصلے کے وقت ہی معلوم ہو سکتی ہے، اور وہ فیصلے کا وقت انتخابات کے موقع پر ہی آتا ہے۔ یہ وہ پیمانہ ہے جو ہر چند سال کے بعد معاشرے کے ذہن و اخلاق کی حقیقی حالت اور اس کی بھلائی اور برائی کا ایک ایک پہلو ناپ کر دکھا دیتا ہے۔ یہ ایک مردم شماری ہے جو گن کر بتا دیتی ہے کہ آپ کے معاشرے میں کتنے ووٹ بیچنے والے ہیں، کتنے دباؤ میں آنے والے ہیں، کتنے فریب کھانے والے ہیں، کتنے تعصبات میں مبتلا ہیں، کتنے غیر اسلامی نظریات سے متاثر ہوئے ہیں، کس قدر دھاندلیاں یہاں چلتی ہیں، اور ان سب کے درمیان کتنے لوگوں کو آپ واقعی اسلامی نظام کی حمایت کے لیے تیار کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس میزان کا سامنا کیے بغیر آخر کس ذریعے سے آپ یہ معلوم کریں گے کہ چند سال تک آپ نے معاشرے[۱] کی اصلاح کے لیے جو محنت کی ہے اس سے حقیقت میں کتنی اصلاح ہوئی اور کتنی ابھی کرنی باقی ہے

۱؎ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں یہ پیمانہ ہم کو ناپ تول کر بتا چکا ہے کہ مغربی پاکستان کے ایک بڑے حصے میں ہماری

انتخابات سے الگ رہنے کے نتائج ان غلط مفروضات پر جس تجویز کی بنا رکھی گئی ہے، اب ذرا خود اس کا جائزہ لے کر دیکھیے کہ اگر ہم اس پر عمل کریں تو اس کے نتائج کیا ہونگے۔

انتخابات کے موقع پر اگر ہم خود میدان مقابلہ میں آکر ووٹر کی عملی رہنمائی نہ کریں تو ہماری محض تبلیغ اور اخلاقی تلقین اُس کے لیے بے معنی ہوگی۔ اس کے سامنے تو اُس وقت یہ عملی سوال درپیش ہوگا، اور یہی سوال وہ ہمارے سامنے بھی رکھے گا کہ "میں اپنا ووٹ استعمال کروں یا نہ کروں، اور کروں تو کس کے حق میں؟" اس کے جواب میں ہمارا صرف یہ کہہ کر رہ جانا کہ تم ایماندار ی کے ساتھ صالح آدمی کو ووٹ دو اور غیر صالح کو نہ دو، اس کے سوال کا درحقیقت کوئی جواب نہ ہوگا۔ وہ تو یہ کہے گا کہ کوئی صالح آدمی ہے تو اسے سامنے لاؤ۔ یا جو لوگ انتخاب کے لیے کھڑے ہوئے ہیں ان میں سے کسی کو بتاؤ کہ میں اس کو ووٹ دوں۔ اگر ہم اس کے اس مسئلے کو حل نہیں کرتے تو وہ ہم سے مایوس ہو جائے گا۔ وہ سمجھ لے گا کہ یہ اس وقت میرے کسی کام نہیں آسکتے۔ ہماری تبلیغ و تلقین اس پر بے اثر ہوگی اور بالعموم اس کا ووٹ غلط جگہ ہی استعمال ہوگا۔ یا حد سے حد اگر اس تبلیغ کا کوئی اثر اس نے قبول کیا بھی تو وہ اس شکل میں ہوگا کہ وہ سرے سے کہیں ووٹ ہی نہ دیگا، یعنی محض ایک منفی اثر۔ جو طاقت مثبت طور پر ایک صحیح مقصد کے لیے استعمال کی جاسکتی تھی، وہ صرف رائگاں چلی جائیگی اور انتخاب پر کچھ بھی اثر انداز نہ ہوگی۔

یہ معاملہ تو عام ووٹر کے ساتھ پیش آئے گا۔ رہے جماعت اسلامی کے ارکان، منفقین، متاثرین، اور وہ لوگ جو رہنمائی کے لیے اس کی طرف دیکھتے ہیں، تو یقیناً ان کی بہت بڑی اکثریت کو انتخابات میں اپنا ووٹ استعمال کرنے سے احتراز ہی کرنا پڑے گا، کیونکہ اس ملک کے طول و عرض میں کم ہی مقامات ایسے ہونگے جہاں کسی شخص کو ووٹ دینے کا فیصلہ ہم کر سکیں۔

اب ذرا حساب لگا کر دیکھیے کہ جماعت اسلامی کے اپنے حلقۂ اثر کے ووٹ پورے پاکستان میں

۴۔ دس سال کی سعی اصلاح نے عملاً کتنے نتائج پیدا کیے تھے (ملاحظہ ہو روداد مجلس شوریٰ اپریل ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۵، مسلمانوں کا ماضی و حال اور مستقبل کا لائحہ عمل صفحہ ۵۶ - ۵۷)

کس قدر ہیں، اور عوام میں اپنی تبلیغ اور جدوجہد سے وہ کتنے ووٹروں کو بالفعل متاثر کرسکتی ہے آپ کسی مبالغہ کے بغیر یہ تسلیم کریں گے کہ مجموعی طور پر یہ تعداد کئی لاکھ تک پہنچتی ہے[1]۔ اس چیز کو نگاہ میں رکھ کر آپ خود اندازہ کیجیے کہ یہ منفی پالیسی اختیار کرکے ہم کتنی بڑی طاقت ضائع کریں گے۔ یہ وہ وزن ہے جو خیر کے پلڑے میں ڈالا جاسکتا ہے، اور جسے کسی شر کا پلڑا ہلکا کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ آخر کیا معقول وجہ ہے کہ ہم اس کو یوں ضائع کریں۔

اس پالیسی کا نقصان صرف یہی نہ ہوگا کہ ہم خیر کے لیے کام آنے والی ایک طاقت کو معطل کریں گے۔ بلکہ درحقیقت یہ پالیسی متعدد وجوہ سے شر کے لیے مثبت طور پر مددگار ہوگی:

— اس کی بدولت انتخابات کا یہ نتیجہ تو بہرحال سارے ملک کے سامنے آئے گا کہ یہاں غیر اسلامی نظریات سے متاثر ہونے والے، یا تعصبات اور خوف اور لالچ کے زیر اثر رائے دینے والے کتنے ہیں۔ لیکن یہ بات مبہم ہی رہے گی کہ اس آبادی میں کتنے لوگ اسلامی نظامِ زندگی کے حامی ہیں اور اس کی خاطر ایمانداری کے ساتھ اپنا ووٹ دے سکتے ہیں۔ یہ چیز بگاڑ کی طاقتوں کے لیے حوصلہ افزا اور اصلاح کی کوشش کرنے والوں کے لیے ہمت شکن ہوگی، اور عام طور پر پبلک کے نفسیات پر بھی اس کا تباہ کن اثر پڑے گا۔

— اس سے عام لوگوں میں مایوسی پیدا ہوجائے گی کہ موجودہ قیادت سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہے، اس لیے وہ دل چھوڑ کر اس کے آگے ہتھیار ڈال دیں گے۔

— لوگ اس بات سے بھی مایوس ہوجائیں گے کہ یہاں اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لیے عملاً کچھ کیا جاسکتا ہے۔ وہ دیکھیں گے کہ جو لوگ اسی کام کا بیڑا اٹھا کر نکلے تھے وہ فیصلے کے وقت پیچھے ہٹ گئے۔ اس سے یقیناً عام ذہن یہی اثر لے گا کہ اسلامی نظام کی باتیں محض وعظوں کے لیے ہیں، کر کے دکھا دینے والا کوئی نہیں ہے۔

[1] واضح رہے کہ چھ سال پہلے جبکہ ہماری تحریک عوام میں کام کرنے کی ابتدا کر رہی تھی، اور پہلی بار ہم انتخاب کے میدان میں آئے تھے، ہم نے صرف پنجاب میں دو لاکھ سترہ ہزار آدمیوں سے ووٹ حاصل کیے تھے اور ان کے مجموعی ووٹ چار لاکھ کے قریب تھے۔

— میدان میں صرف وہ عناصر رہ جائیں گے جو معاشرے کے ذہن اور اخلاق کو بگاڑنے والے اور فاسد قیادتوں کو بر روئے کار لانے کی کوششیں کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ اس ملک کی پوری بالغ آبادی میں اپنی فکری اور اخلاقی گمراہیاں پھیلائیں گے، اور ایک ایک ووٹر تک اپنے ناپاک اثرات پہنچا دیں گے۔ جواب میں کوئی طاقت ایسی نہ ہوگی جو اس زہر کا مداوا کر سکے۔ جماعت اسلامی انتخابات میں محض بھلائی کا وعظ کہنے کے لیے خواہ کتنا ہی بڑا پروگرام بنائے، لیکن میدان مقابلہ میں اترے بغیر فطرۃً یہ کسی طرح ممکن نہ ہوگا کہ کارکن ہر ووٹر تک پہنچیں اور ہر انتخابی حلقے میں برائی کے بالمقابل بھلائی کا عملی مظاہرہ کر سکیں۔

— ووٹر کو عملاً صرف فاسد و مفسد عناصر ہی سے سابقہ ہوگا۔ اس کے سامنے ان کا کوئی بدل سرے سے ہوگا ہی نہیں کہ وہ ان کے سوا کسی اور کو ووٹ دینے کی سوچ سکے۔ جو شخص بھی اپنا ووٹ استعمال کرے گا اس کا ووٹ لامحالہ انہی میں سے کسی کو جائے گا۔ اور جو نہ کرے گا اس کا وزن کسی پلڑے میں پڑیگا ہی نہیں کہ اس کا کوئی اچھا یا برا اثر مترتب ہو۔

— اس طرح ہم یہاں غیر اسلامی اور غیر اخلاقی طاقتوں کو چھا جانے کا کھلا موقع دے دیں گے۔ وہ ایوانِ حکومت کے اندر بھی اس طرح چھائیں گی کہ کوئی دینی عنصر ان کو اور ان کی باتوں کو چیلنج کرنے والا نہ ہوگا۔ اور باہر پبلک کے ذہن پر بھی مسلط ہو جائیں گی، کیونکہ اسلامی نظام زندگی کی حمایت کرنے والا عنصر اس کو عملاً مایوس کر چکا ہوگا۔

یہ ہیں اس پالیسی کے لازمی نتائج جن سے ہم کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ اب جو شخص ہم سے یہ کہنا چاہتا ہو کہ ہمیں پھر بھی انتخابات سے الگ ہی رہنا چاہیے، اُسے یہ بتانا ہوگا کہ انتخابات میں حصہ لینے کے وہ کونسے نقصانات ہیں، اور الگ رہنے کے وہ کونسے فوائد ہیں جنہیں وہ ان نتائج کے مقابلے میں زیادہ وزنی ثابت کر سکتا ہو۔

کچھ اور وجوہِ اختلاف اس سلسلے میں جو باتیں مجھے اس خیال کے حامیوں سے سننے کا موقع ملا ہے اُن میں زیادہ سے زیادہ قابلِ لحاظ باتیں صرف تین ہیں:

ایک یہ کہ انتخابات میں حصہ لے کر جماعت کے اخلاق کا ستیاناس ہو جائے گا۔ وہ بے لگام سیاسی کھلاڑیوں کے مقابلے میں کشمکش کرنے کے لیے آگے بڑھے گی تو انہی کی سی باتیں کرنے لگے گی اور انہی کے سے کھیل کھیلنے لگے گی۔

دوسرے یہ کہ جہاں انتخابات میں وہ ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہوں جو پنجاب، سرحد اور بہاولپور کے انتخابات میں استعمال کیے گئے تھے، اور جہاں عوام الناس صرف غفلت ہی کے شکار نہ ہوں بلکہ اپنی مختلف کمزوریوں کی بنا پر ان کی بڑی اکثریت ووٹ کا حق غلط جگہ استعمال کرتی ہو، وہاں کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں، اور ناکامی کا نتیجہ یقیناً انتہائی دل شکن ہو گا۔

تیسرے یہ کہ اگر مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں چند نشستیں حاصل کر بھی لی گئیں تو اس کا حاصل کیا ہو گا؟

اخلاقی دیوالہ کا خدشہ | پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ جماعت اسلامی آج تک برائیوں کے مقابلے میں کشمکش کر کے بھلائی کو نشوونما دینے کی قائل رہی ہے، اور اس کے اندر اچھے یا برے، جو کچھ بھی اخلاق بنے ہیں، اسی نظریے پر کام کرنے سے بنے ہیں۔ اب اگر کشمکش اور مقابلے سے ہٹ کر گوشوں میں اخلاق بنانے کا نظریہ اختیار کرنا ہو، تو جماعت کے لوگوں کو سوچ سمجھ کر اس کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ میرا اپنا نقطۂ نظر جسے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں، یہ ہے کہ میدانِ مقابلہ سے ہٹ کر جو اخلاق گوشوں میں بنائے جائیں گے وہ کبھی کارزار میں کام آنے کے قابل نہ ہوں گے۔

پھر یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ اگر پندرہ سولہ سال کی اخلاقی تنظیم کے باوجود جماعت اسلامی کے اخلاق ایسے ہی بودے ہیں کہ سیاسی کھلاڑیوں کے مقابلے میں آتے ہی یہ بھی وہی سب کچھ کرنے لگے گی جو وہ کرتے ہیں، تو آگے کیا امید کی جا سکتی ہے کہ ہم کبھی اس فیصلہ کن معرکے میں قابلِ اطمینان سیرت و کردار لے کر آ سکیں گے؟ اس کے لیے آپ کتنی مدت تجویز کرتے ہیں؟ حصولِ اطمینان کی کیا صورت اور اس کا کیا معیار آپ کے سامنے ہے؟ اس سیرت و کردار کو پیدا کرنے کے لیے وہ کونسا کورس آپ کی نگاہ میں ہے جو عملی آزمائشوں کا سامنا کیے بغیر آپ کے کارکنوں

میں یہ چیز قابلِ اطمینان حد تک پیدا کر دیگا؟ اور اگر ساری کوششوں کے بعد پہلی آزمائش پیش آتے ہی یہ بات کھلے کہ آپ سو فی صدی معیاری آدمی فراہم کرنے میں ناکام ہوئے ہیں تو آپ کا کیا ارادہ ہے؟ ان سیاسی کھلاڑیوں کو نظامِ زندگی کی فرمانروائی سے ہٹانے کے لیے آگے بڑھیں گے یا پھر میدان ان کے ہاتھ چھوڑ کر تربیت گاہوں کی طرف پلٹ جائیں گے؟ میرا خیال یہ ہے کہ اس وہمی پن اور چھوئی موئی کی سی ذہنیت اور اس غیر عملی طرزِ فکر کے ساتھ آپ اس معرکے میں کبھی نہ اُتر سکیں گے۔ اس لیے لامحالہ آپ کو دو باتوں میں سے ایک کا فیصلہ کرنا ہو گا۔ یا تو سوچنے کا یہ انداز بدلیے، یا پھر اس خیال کو چھوڑ دیجئے کہ یہاں اسلامی نظامِ زندگی کو عملاً قائم کرنے کے لیے آپ کو کچھ کرنا ہے۔ کیونکہ یہ کام جب بھی آپ کرنا چاہیں گے، لازماً انہی سیاسی کھلاڑیوں کے مقابلے میں آکر انتخابی جنگ آپ کو لڑنی پڑے گی، اور اس جنگ کے میدان میں اُترنے کا جب بھی آپ ارادہ کریں گے، یہ خدشہ آپ کو ضرور لاحق ہو گا کہ جماعت کہیں اپنا اخلاقی سرمایہ اس میں نہ لٹا بیٹھے۔

اس موقع پر آپ مجھ سے پوچھ سکتے ہیں کہ تم اس خدشے کو وہمی پن، چھوئی موئی کی سی ذہنیت اور غیر عملی اندازِ فکر سے کیوں تعبیر کرتے ہو؟ میں عرض کروں گا کہ میرے پاس اس کے معقول وجوہ ہیں۔

جماعت اسلامی آج گہوارے سے نکل کر نئی نئی میدانِ عمل میں نہیں آئی ہے کہ ہم من حیث الجماعت اس کی قوت و ضعف اور اس کے حسن و قبح کا کوئی اندازہ نہ کر سکتے ہوں۔ دس سال سے وہ پاکستان میں اُن طاقتوں سے عملاً نبرد آزما ہے جو سارے اخلاقی حدود کو بالائے طاق رکھ کر اس کا راستہ روکتی رہی ہیں، اور اس مدت میں وہ ان اکثر و بیشتر آزمائشوں سے گزر چکی ہے جو کسی انسانی گروہ کو پیش آسکتی ہیں۔ اُس کے خلاف جھوٹ کے طوفان بھی اٹھے ہیں۔ اُس پر فتووں کی مار بھی پڑی ہے۔ اُسے گالیوں سے بھی نوازا گیا ہے۔ اُس کو طرح طرح کی سازشوں سے بھی سابقہ پیش آیا ہے۔ اُس کی راہ میں قدرتی اور مصنوعی دونوں ہی قسم کی رکاوٹوں کے پہاڑ حائل ہوتے

ہیں۔ اُس کی تاریخ میں کئی مرتبہ سخت اشتعال انگیز مواقع بھی آئے ہیں۔ وہ لالچ سے بھی آزمائی گئی ہے اور خوف سے بھی۔ اس کو سیاسی پارٹیوں سے ملنے کا بھی اتفاق ہو چکا ہے اور لڑنے کا بھی۔ اُس کو انتہائی دل شکن اور مایوس کُن حالات کا بھی بارہا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور سیاسی جوڑ توڑ کی اس فضا میں، جو برسوں سے اس ملک میں طاری ہے۔ ہر وقت ایسے مواقع بھی موجود رہے ہیں کہ اگر اس کی اجتماعی سیرت میں ذرا سا جھول بھی ہوتا تو وہ اُس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو سکتی تھی جس میں دوسرے بہت سے لوگ آج غوطے لگا رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، کیا دس سال کے اس مسلسل امتحان نے جماعت کو واقعی اتنا ہی کمزور ثابت کیا ہے جتنا اسے فرض کیا جا رہا ہے؟

پھر انتخابات بھی اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ وہ اس سے پہلے اس امتحان سے بھی گزر چکی ہے۔ اس کے کارکنوں نے جعلی ووٹوں کی ایسی بوچھاڑ کا سامنا کیا ہے، وہ دھاندلیاں دیکھی ہیں، ضمیر بیچنے اور خریدنے کی وہ گرم بازاری دیکھی ہے، سیاسی کھلاڑیوں کے درمیان وہ سودے بازیاں دیکھی ہیں، اور جھوٹ کے اُن طوفانوں کا مقابلہ کیا ہے، جن کی نظیر کبھی اس ملک میں، بلکہ شاید کسی دوسرے ملک میں بھی نہیں دیکھی گئی۔ اُن کو بغیر کسی سابق تجربے کے پہلی مرتبہ اس نوعیت کی انتخابی جنگ میں جھونکا گیا تھا۔ اور ذرائع کی انتہائی قلت کے ساتھ انہیں حکومت کی پیدا کردہ مشکلات سے بھی سابقہ تھا۔ برادریوں کے تعصبات بھی ان کی راہ روک رہے تھے، اور بعض مذہبی طبقوں نے بھی انہیں تنگ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ کیا کوئی بندۂ خدا انصاف کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ جماعت اس امتحان میں اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ ہی ثابت ہوئی تھی؟

یہاں سوال رائے اور اندازوں کا نہیں، واقعہ اور حقیقت کا ہے۔ اور سوال بعض افراد کے شخصی کردار کا بھی نہیں، جماعت کے مجموعی کردار کا ہے۔ کیا کوئی شخص جماعت کے دامن پر اس پورے دس سال کی تاریخ میں کوئی اخلاقی داغ دکھا سکتا ہے؟ اگر نہیں دکھا سکتا تو پھر ماننا پڑے گا کہ اِس وقت اسلام اور جاہلیت کے معرکے میں قدم آگے بڑھانے کے لیے

جو کم سے کم اخلاقی طاقت کافی ہے ، اور جیسی کچھ قابلِ اعتماد اخلاقی طاقت اس بگڑے ہوئے معاشرے کے اندر سے فراہم ہو سکتی ہے ، وہ تو ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کو لے کر ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اجتماعی کوشش سے اسی جدوجہد کے دوران میں مزید اخلاقی طاقت پیدا کی جاسکتی ہے۔ تجربات اور آزمائشوں سے جو کمزوریاں سامنے آئیں انہیں رفع کرنے کی تدبیریں بھی عمل میں لائی جاسکتی ہیں۔ معیار سے گر جانے والوں کو سنبھالا بھی جا سکتا ہے ، اور بدرجۂ آخر نکالا بھی جا سکتا ہے۔ ان ساری باتوں کو نظر انداز کر کے جو لوگ کچھ خیالی خطرے ہمارے سامنے رکھتے ہیں ، کچھ انفرادی واقعات کو جوڑ جاڑ کر جماعت کی مجموعی حالت کا ایک بھیانک نقشہ ہمارے سامنے کھینچتے ہیں ، اور کام کرنے کے لیے شرط کے طور پر ایسے اخلاقی معیار کا مطالبہ کرتے ہیں جس کو وہ خود متعین بھی نہیں کر سکتے ، اُن کے متعلق آخر میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ وہ غیر عملی اندازِ فکر میں مبتلا ہیں ، ان کے تخیلات کی دنیا واقعات کی دنیا سے باہر کہیں واقع ہے ، اور ان کی طرح اگر مختلف افراد کی انفرادی کمزوریوں کو ہم جماعت کی مجموعی کمزوری ٹھیرا کر پوری جماعت کو ناقابلِ کار سمجھنے لگیں تو ایسا وقت آنے کی کبھی امید نہیں کی جاسکتی کہ یہ جماعت کیا ، کوئی انسانی جماعت بھی قابلِ کار قرار پا سکے۔ پھر تو بہتر یہی ہے کہ ٹھنڈے دل سے اس دنیا کو فساق و فجار کے سپرد کیجیے اور صرف وعظ و تبلیغ کر کے اپنے دل کو تسلی دے لیجیے کہ یہاں اقامتِ دین کا فریضہ بس اسی حد تک انجام دیا جا سکتا ہے۔

ناکامی کا خطرہ اب دوسری وجہ کو لیجیے۔ اُس میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ سیاسی گروہ اور اصحابِ اقتدار جو انتخابی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں ان کے مقابلے میں کامیاب ہونا بہت مشکل ہے ، اور مزید مشکل یہ ہے کہ عوام الناس غافل بھی ہیں اور ان کی بڑی اکثریت جان بوجھ کر بھی غلط جگہ ووٹ دیتی ہے۔ اس حالت میں اگر ہم انتخابات میں حصہ لیں گے تو زیادہ تر امکان اس امر کا ہے کہ ناکام ہوں گے۔ اور اس ناکامی کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ کارکن بددل ہوں گے ، تحریکِ اسلامی سے دلچسپی رکھنے والوں میں مایوسی پھیلے گی ، اور پبلک میں بھی اس تحریک کی ہوا اکھڑ

جائے گی۔ لہٰذا ہمیں انتخابات سے الگ رہ کر وہ حالات پیدا کرنے چاہئیں جن میں کامیابی اگر یقینی نہ ہو تو کم از کم کسی بڑی ناکامی کا خطرہ تو نہ ہو۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان حالات میں واقعی کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ ناکامی کا اثر پبلک کے ذہن پر بھی بُرا پڑتا ہے، تحریک کے حامی بھی دل شکستہ ہوتے ہیں، اور خود ہمارے کارکنوں میں بھی اس سے کچھ نہ کچھ بد دلی ضرور پیدا ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ انتخابات سے الگ رہنے کے لیے یہ کوئی صحیح اور معقول وجہ ہے۔ کیونکہ ناکامی کے جو اسباب بیان کیے جارہے ہیں ان میں سے کسی سبب کو بھی انتخابات میں حصہ لیے بغیر دُور نہیں کیا جا سکتا۔ الگ رہنے سے یہ اسباب گھٹیں گے نہیں بلکہ اور زیادہ بڑھتے چلے جائیں گے۔ ان کے علاج کی صورت اگر کوئی ہے تو یہی کہ ہم پے در پے اس معرکہ میں گھس کر ان کا مقابلہ کرتے رہیں اور ان کا زور توڑتے چلے جائیں۔

آپ خود ذرا غور کر کے دیکھیں۔ یہ انتخابی ہتھکنڈے جو سیاسی پارٹیاں استعمال کرتی ہیں اور جن کے استعمال میں زمام کار کے موجودہ مالک طاق بھی ہیں اور بے باک بھی، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ خود بخود متروک ہو جائیں گے؟ کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ رفتہ رفتہ یہ لوگ آپ ہی اتنے نیک ہو جائیں گے کہ ان ہتھکنڈوں کے استعمال سے انہیں شرم آنے لگے گی؟ اور کیا آپ زمام کار کی تبدیلی کے لیے اُس ساعتِ سعید کا انتظار کرنا چاہتے ہیں جب مقابلہ صرف شریف آدمیوں سے رہ جائے اور بُرے لوگ میدان سے ہٹ جائیں؟ اگر یہ آپ کی امیدیں ہیں، اور یہ وہ شرطیں ہیں جن کے پورا ہونے پر ہی آپ قیادت بدلنے کے اس واحد آئینی وسیلہ سے کام لے سکتے ہیں، تو میں نہیں سمجھتا کہ کبھی آپ کی یہ امیدیں اور یہ شرطیں پوری ہوں گی اور آپ اس کارِ خیر کے لیے آگے بڑھ سکیں گے۔ تبدیلیٔ قیادت کے لیے آپ واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ اس گندے کھیل میں پاکیزگی کے ساتھ آئیے۔ تمام بُرے ہتھکنڈوں کا مقابلہ صحیح طریقوں سے کیجیے۔ جعلی ووٹ کے مقابلے میں اصلی ووٹ لائیے۔ دھن سے ووٹ

خریدنے والوں کے مقابلے میں اصول اور مقصد کی خاطر ووٹ دینے والے لاکر دکھائیے دھوکے اور فریب اور جھوٹ سے کام لینے والوں کے مقابلے میں سچائی اور راستبازی کا مظاہرہ کیجئے۔ دھونس اور زبردستی سے ووٹ لینے والوں کے مقابلے میں ایسے ووٹر پیش کیجیے جو بلے خوف ہوکر اپنے ضمیر کے مطابق ووٹ دیں۔ دھاندلیوں کے مقابلے میں ٹھیٹھ ایمانداری برت کر دکھائیے۔ ایک دفعہ نہیں، دس دفعہ ناکامی ہوتو ہو۔ آپ کوئی تبدیلی یہاں لاسکتے ہیں تو اسی طریقے سے لاسکتے ہیں۔ اسی طرح آخر کار وہ وقت آئے گا جبکہ سارے ہتھکنڈوں کے باوجود غلط کار لوگ شکست کھا جائیں گے۔ اسی طرح یہاں کے انتخابی نظام کی برائیاں بے نقاب ہونگی۔ اسی طرح ان برائیوں کے خلاف عام نفرت اور بیزاری پیدا کی جاسکے گی۔ اسی طرح انتخاب کے طریقوں کی اصلاح کا راستہ کھلے گا۔

پھر جس پبلک کی غفلت، بے حسی اور اخلاقی کمزوریوں کا آپ رونا روتے ہیں۔ اس کی اصلاح بھی آپ کے اسی عمل سے ہو سکے گی۔ اسی سے اس کا ضمیر بیدار ہو گا۔ اسی سے لوگوں کو یہ امید بندھے گی کہ یہاں بھلے طریقوں سے بھی کام کیا جاسکتا ہے۔ اس سے لوگوں کا خوف بھی دور ہو گا، ووٹ فروشی کا مرض بھی کم ہوتا جائے گا، اور رائے عام کی اتنی تربیت بھی ہوتی چلی جائے گی کہ ہمارے عام ووٹر اغراض اور تعصبات کی بنا پر ووٹ دینے کے بجائے اصول اور نظریات کی بنا پر بے لاگ طریقے سے ووٹ دینے کے قابل ہو جائیں گے۔

بلاشبہ یہ ایک دشوار گزار گھاٹی ہے۔ اس میں ٹھوکریں لگیں گی۔ ناکامیاں ہونگی۔ کمزور دل کے لوگ دل شکستہ بھی ہونگے۔ تحریک سے دلچسپی رکھنے والوں میں سے بھی بہت سے لوگ مایوسی سے دوچار ہونگے۔ اور ظاہر ہیں پبلک کا بھی ایک اچھا خاصا حصہ ان ابتدائی ناکامیوں کا غلط مطلب لے گا۔ لیکن منزلِ مقصود تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس گھاٹی کے سوا نہیں ہے۔ اور مجھے اس میں اتنی بڑی ناکامی کا خطرہ بھی نہیں ہے جس کا ہوّا ہمیں دکھایا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم ساری ناجائز تدبیروں کے مقابلے میں، اسی غافل اور کمزور پبلک کے اندر سے

ٹھیٹھ اصولی طریق کار برت کر، چند لاکھ ووٹ ضرور لے کر دکھا دیں گے، اور یہ چیز انشاء اللہ اس ملک کے تمام اصلاح پسند اور دین پسند طبقوں میں یاس کے بجائے امید کی شمع روشن کر دیگی پھر میں یہ بھی توقع رکھتا ہوں کہ ایک انتخاب میں ایسے ووٹوں کا جو تناسب ہوگا وہ بعد کے انتخابات میں گھٹے گا نہیں، بلکہ انشاء اللہ العزیز برابر بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ آخر کار میزان کا رخ پلٹ کر رہے گا۔

صرف چند نشستوں کا حاصل ؟ | رہی یہ بات کہ اس وقت اگر صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں چند نشستیں حاصل کر بھی لی گئیں تو ان کا حاصل کیا ہوگا، تو میں عرض کروں گا کہ اس سے کچھ نہیں، بہت کچھ حاصل ہوگا۔

اس وقت جماعت اسلامی صرف پبلک میں کام کر رہی ہے۔ جو با اختیار ادارے ملک کے نظام کو چلانے کی اصل طاقت رکھتے ہیں ان میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اسی لیے وہ اپنے تمام اخلاقی اور ذہنی اثرات کے باوجود یہاں کے حالات پر براہ راست اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ انتخابات میں چند نشستیں حاصل کر لینے کے بعد یہ پوزیشن بدلنی شروع ہو جائیگی۔ ایک مرتبہ آپ اس ملک کی سیاسی تصویر میں جگہ پا لیں۔ پھر آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ آپ کی بات کا وزن کتنا بڑھ گیا ہے۔

اب تک آپ صرف پبلک میں اپنی آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ ایوانِ حکومت میں، جو فیصلے کی جگہ ہے، آپ کی کوئی آواز نہیں ہے۔ وہاں پہنچ کر آپ کی آواز دونوں جگہ بلند ہوگی، اور ان لوگوں سے زیادہ وزنی ہوگی جن کی آواز صرف ایوانِ حکومت ہی میں ہے، یا باہر کچھ ہے بھی تو پبلک کی کوئی قابلِ لحاظ تائید اس کو حاصل نہیں ہے۔

وہاں ایک ایسے گروہ کی موجودگی جو اربابِ اقتدار اور تمام سیاسی پارٹیوں کے سامنے ہر موقع پر کلمۂ حق کہے، صاف صاف اور بے لاگ طریقے سے غلط چیزوں پر تنقید کرے، دلیل کے ساتھ صحیح بات پیش کرے، اور اسلام کے مطابق جو اصلاحات اس ملک کے

نظام اور قوانین میں ہونی چاہئیں ان کو معقول تجویزوں اور مسودہ ہائے قوانین کی شکل میں مرتب کرکے قبول یا رد کرنے کے لیے رکھ دے، درحقیقت ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہوگی۔ اس کی قوت کا اندازہ آپ صرف اُن لوگوں کی تعداد کے لحاظ سے نہ لگائیے جو اس گروہ میں شامل ہونگے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب حق بات کہہ دی جائے گی تو رُو در رُو اُسے جھٹلانا اور جب اسلام کا مطالبہ ایک قرارداد یا مسودۂ قانون کی صورت میں رکھ دیا جائے گا تو اسے رد کر دینا کس قدر مشکل ہوگا، اور رد کرنے والوں کی پوزیشن کیا بنے گی۔

پھر وہ گروہ جو ایوانِ حکومت میں پہنچ کر ایک خالص اصولی پارٹی کی حیثیت سے کام کرے، کسی سیاسی جوڑ توڑ میں حصہ نہ لے، کسی سے سودے بازی نہ کرے، کسی عہدہ و منصب کے لیے ضمیر نہ بیچے، اربابِ اقتدار سے کوئی ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے، اور جس کے ممبروں کو توڑنا پہاڑ توڑنے سے زیادہ مشکل ثابت ہو، اس کا وجود اس ملک کی سیاسی زندگی میں ایک ایسا وزن اور وقار پیدا کرے گا جو کسی بڑی سے بڑی پارٹی کو بھی حاصل نہ ہوگا اس وزن کا اندازہ بھی آپ صرف اُن ووٹوں کی تعداد کے لحاظ سے نہیں لگا سکتے جو اسمبلیوں میں بالفعل اس گروہ کو حاصل ہونگے۔ اُس کی رائے دہی کی طاقت خواہ کتنی ہی کم ہو، اس کا اخلاقی اثر اسمبلیوں کے باہر بھی بہت زیادہ ہوگا اور ان کے اندر بھی۔ درحقیقت وہ اپنے عمل سے اس ملک میں اُن تمام لوگوں کی امیدوں کا مرجع بن جائے گا جو یہاں کی سیاسی پارٹیوں کا کردار دیکھ دیکھ کر مایوس ہو رہے ہیں، اور دوسرے انتخاباتِ عام کی نوبت آنے تک آپ خود دیکھ لیں گے کہ اس سے جماعتِ اسلامی کے اثر اور قوت میں کتنا اضافہ ہو گیا ہے۔

یہ خیال کرنا بھی درست نہیں ہے کہ یہ گروہ جتنی تعداد میں اندر جائے گا وہی اس کی تعداد اسمبلی کی عمر تمام ہونے تک رہے گی۔ میں اس کے برعکس یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہاں اس کی تعداد برابر بڑھتی چلی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسمبلیوں میں جو لوگ دوسرے مختلف

راستوں سے پہنچتے ہیں وہ سب بالکل بے ضمیر ہی نہیں ہوتے۔ ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جن کے اندر کہیں نہ کہیں ضمیر نام کی ایک چیز بھی دبی چھپی موجود ہوتی ہے۔ وہ وہاں کے گندے کھیل دیکھ دیکھ کر وقتاً فوقتاً سخت بیزاری کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مگر نہ خود کوئی پارٹی بنانے کی ہمت رکھتے ہیں، نہ کوئی ایسی پارٹی موجود ہوتی ہے جس کا دامن ان گندگیوں سے پاک ہو اور وہ اس سے جا ملیں۔ اگر ایک با اصول اور ایماندار گروہ وہاں کام کرنے کے لیے پہنچ جائے اور اپنے عمل سے اپنا اعتماد قائم کر دے، تو یہ ہمیشہ ممکن رہے گا کہ جب کبھی کسی ایم ایل اے کا ضمیر جاگ اٹھے، وہ اس گروہ سے آملے۔

آخری بات اس سلسلے میں یہ بھی سمجھ لیجیے کہ پارلیمنٹری نظام میں ایک پارٹی کی طاقت صرف اس کے ممبروں کی تعداد کے مطابق ہی نہیں ہوا کرتی۔ متعدد پارٹیوں کے ایوان میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ توازنِ قوت ایک قلیل التعداد گروہ کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ ابن الوقت اور غرض پرست گروہ ایسے مواقع کو سودے بازی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ایسا منظم گروہ وہاں موجود ہو جو اپنے سامنے ایک بلند مقصد رکھتا ہو اور صرف اپنے مقصد ہی کی خاطر اختلاف اور اتفاق کر سکتا ہو، تو وہ قلیل التعداد ہونے کے باوجود بڑی بڑی پارٹیوں سے اپنی بات منوا سکتا ہے، اور اس کی متعدد مثالیں آپ خود اپنے ملک میں دیکھ چکے ہیں۔ پاکستان میں اس وقت سیاسی پارٹیوں کے جو رنگ ڈھنگ ہیں، اور اسمبلیوں میں پہنچ کر وہ جس طرح آپس میں اقتدار کے لیے کشمکش، اور ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کرتی ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ مضبوط سیرت رکھنے والے چند آدمیوں کا ایک چھوٹا سا بلاک بھی اگر ان کے درمیان موجود ہو تو وہی ان سب پر حکمرانی کر سکتا ہے۔

۵۔ بالواسطہ اور بلاواسطہ اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرارداد میں انتخابات کے متعلق جو پالیسی تجویز کی گئی ہے وہ بالکل درست ہے، اور اپنے لائحۂ عمل کے سیاسی پہلو کی تکمیل کے لیے ہمیں لازماً اسی پالیسی پر عمل کرنا چاہیے۔

اس کے بعد صرف اس امر کی تشریح باقی رہ جاتی ہے کہ انتخابات میں بلاواسطہ کے ساتھ بالواسطہ حصہ لینے کا مطلب کیا ہے، اور وہ کیا مصالح ہیں جن کی بنا پر یہ دوسرا طریقہ بھی اس پالیسی میں شامل کیا گیا ہے۔

جہاں تک بالواسطہ کے مفہوم کا تعلق ہے، اس میں بجائے خود کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم براہِ راست اپنے اہتمام سے کچھ لوگوں کو بھیجنے کے ساتھ ایسے عناصر کو بھی کامیاب کرانے کی کوشش کریں گے جو اسلامی نظام کے مقصد میں ہم سے متفق ہیں اور جن سے ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اس کے قیام کی کوشش میں مددگار بن سکیں گے۔ لیکن اصل پیچیدگی ان مصالح کو سمجھنے میں پیش آتی ہے جن کی بنا پر ہم اپنی پالیسی میں اس چیز کو شامل کر رہے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں اُن حالات پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے جن میں ہم یہ دشوار گزار گھاٹی طے کرنی ہے۔

حالات کا ایک رُخ یہ ہے کہ نئے دستور کی رُو سے سارے ملک کی صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کی ۹ سو سے کچھ زیادہ نشستیں ہیں، جن پر بیک وقت انتخابی مقابلہ درپیش ہوگا۔ ہمارے پاس اس وقت اتنے ذرائع موجود نہیں ہیں کہ ہم ان تمام نشستوں پر، یا ان کی اکثریت پر بلاواسطہ مقابلہ کر سکیں۔ صرف اس کے مصارف ہی کا آپ اندازہ کریں تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ یہ کام ہمارے لیے کس قدر مشکل ہے۔

دوسرا رُخ یہ ہے کہ جماعت کے اثرات سارے ملک میں یکساں نہیں ہیں۔ کچھ حلقے ایسے ہیں جن میں ہم اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ براہِ راست خود اپنے انتخابی نظام کے تجویز کردہ آدمیوں کو کامیاب کرا لینا ہمارے لیے ممکن ہے۔ لیکن بہت سے حلقے ایسے بھی ہیں جن میں ہماری طاقت اس پیمانے کی تو نہیں ہے، البتہ اتنی ضرور ہے کہ ہماری تائید کسی اچھے اور مفید آدمی کی کامیابی کے لیے، اور ہماری مخالفت کسی بُرے آدمی کو روکنے کے لیے مؤثر ہو سکتی ہے۔ ایسے حلقوں میں اپنی اس طاقت کو معطل رکھنا اور اسے کسی مصرف میں نہ

لانا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔

تیسرا رُخ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جماعت اسلامی سے باہر بھی ایسے گروہ اور افراد موجود ہیں جو لادینی کے مخالف اور دینی نظام کے حامی ہیں۔ ہماری پہلے بھی یہ خواہش اور کوشش رہی ہے، اور اب بھی یہ ہونی چاہیے کہ لادینی کی حامی طاقتوں کے مقابلہ میں ان تمام عناصر کے درمیان اتفاق اور باہمی تعاون ہو، اور ان کی قوتیں ایک دوسرے کی مزاحمت میں صرف ہو کر مخالفِ دین عناصر کے لیے مددگار نہ بنیں۔ یہی کوشش ہمیں آئندہ انتخابات میں بھی کرنی ہے تاکہ آئندہ اسمبلیوں میں اسلامی نقطۂ نظر کی وکالت کرنے کے لیے ہماری پارلیمنٹری پارٹی تنہا نہ ہو بلکہ ایک اچھی خاصی تعداد دوسرے ایسے لوگوں کی بھی موجود رہے جو اس خدمت میں اُس کا ساتھ دینے والے ہوں۔ اس لیے ہم دل سے یہ چاہیں گے کہ جن حلقوں میں ہم براہِ راست انتخابی مقابلہ نہیں کر رہے ہیں وہاں ہماری طاقت بے کار ضائع ہونے کے بجائے کسی حامیٔ دین گروہ یا فرد کے حق میں استعمال ہو۔ بلکہ ہم اس حد تک بھی جائیں گے کہ جہاں ایسا کوئی گروہ یا فرد نہیں اٹھ رہا ہے وہاں کسی نیک اور موزوں آدمی کو خود اٹھنے کا مشورہ دیں اور اپنی تائید سے اس کو کامیاب کرانے کی کوشش کریں، بشرطیکہ اس کے اپنے اثرات بھی اس کے حلقے میں کافی ہوں، اور اس کی انتخابی جدوجہد کا سارا بار ہم پر نہ آ پڑے۔

حالات کے ان تینوں پہلوؤں کو نگاہ میں رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو پوری طرح اطمینان ہو جائے گا کہ اس قرارداد کی تجویز کردہ انتخابی پالیسی میں بلاواسطہ کے ساتھ بالواسطہ کی گنجائش ٹھیک رکھی گئی ہے۔ یہ دراصل ایک خلا تھا جو ہماری سابق پالیسی میں پایا جاتا تھا۔ تجربے، اور حالات کے مشاہدے نے ہم کو یہ احساس دلایا کہ اس کو بھرنا حکمت کا تقاضا ہے۔ میرے نزدیک کوئی گروہ اِسی زمانے میں نہیں، کسی زمانے میں بھی جاہلیت سے لڑ کر اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تجربات سے سبق سیکھ کر، اور حالات کو سمجھ کر اپنی پالیسیوں میں ایسا ردّ و بدل نہ کرتا رہے جس کی حدودِ شرع کے اندر گنجائش

ہو۔ آپ کو اگر فی الواقع یہ کام کرنا ہے اور صرف تبلیغ کا فرض انجام دے کر نہیں رہ جانا ہے، تو اپنے اوپر اُن پابندیوں کو کافی سمجھیے جو خدا اور رسول کی شریعت نے آپ پر عائد کی ہیں اور اپنی طرف سے کچھ زائد پابندیاں عائد نہ کر لیجیے۔ شریعت پالیسی کے جن تغیرات کی وسعت عطا کرتی ہو، اور عملی ضروریات جن کی متقاضی بھی ہوں ان سے صرف اس بنا پر اجتناب کرنا کہ پہلے ہم اس سے مختلف کوئی پالیسی بنا چکے ہیں، ایک بے جا جمود ہے۔ اس جمود کو اختیار کر کے آپ "اصول پرستی" کا فخر کرنا چاہیں تو کر لیں، مگر یہ حصولِ مقصد کی راہ میں چٹان بن کر کھڑا ہو جائیگا اور اس چٹان کو کھڑا کرنے کے آپ خود ذمہ دار ہونگے، کیونکہ اللہ اور اس کے رسول نے اسے کھڑا نہیں کیا ہے۔

وسیع پالیسی کی ضرورت قرارداد صرف یہ چاہتی ہے کہ اجتماعِ عام وسیع بنیادوں پر ایک پالیسی بنا کر جماعت کو وہ دے جس میں حالات اور ضروریات کے مطابق کام کرنے کی کافی گنجائش ہو۔ اس کے بعد یہ چیز اپنی مجلسِ شوریٰ پر چھوڑ دیجیے کہ وہ موقع و محل کا لحاظ کر کے ان حدود کے اندر جس طریقے سے مناسب سمجھے کام کرنے کا فیصلہ کرے۔ آپ کو قطعی طور پر جو فیصلہ دینا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جماعت اس ملک کے انتخابات سے بے تعلق نہیں رہیگی، تاکہ اس معاملے میں تذبذب ختم ہو اور جماعت کے اندر اُن بحثوں کا دروازہ بند ہو جائے جو سیاسی کام کرنے یا نہ کرنے اور انتخابات میں حصہ لینے یا نہ لینے کے متعلق چھڑ گئی ہیں اور کارکنوں کے ذہن پراگندہ کیے دے رہی ہیں۔ رہی یہ بات کہ آپ انتخابات میں کس طرح حصہ لیں، تو اس کے لیے ایک وسیع پالیسی بنا کر مجلسِ شوریٰ کو دے دیجیے اور اس کی تفصیلات اس اجتماعِ عام میں طے کر کے اپنے ہاتھ نہ باندھ لیجیے، کیونکہ جتنے جزئیات کا فیصلہ کرتے آپ چلے جائیں گے انہیں بدلنے کی اگر کبھی ضرورت پیش آ گئی تو پھر اجتماعِ عام ہی بلانا پڑے گا، اور آپ جانتے ہیں کہ بات بات پر اتنا بڑا اجتماع منعقد کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

خاتمۂ کلام رفقائے عزیز! میں نے اپنی عادت کے خلاف، اور اپنی قوتِ برداشت سے بڑھ کر، اس قرارداد پر چھ گھنٹے کی یہ لمبی تقریر اس لیے کی ہے کہ آپ جو فیصلہ بھی کریں خوب سوچ سمجھ کر اور ہر پہلو پر نگاہ رکھ کر کریں۔ یہ قرارداد آپ کے آج تک کے پورے کام کے متعلق بھی ایک فیصلہ دے رہی ہے، اور آئندہ کے لیے وہ لائحۂ عمل بھی طے کر رہی ہے جس پر آپ کو ایک مدتِ دراز تک کام کرنا ہوگا۔ اس کو قبول یا رد کرنے سے پہلے آپ کو اس کے ہر نکتے اور ہر مضمون کے متعلق پوری بصیرت حاصل ہونی چاہیے۔

مجھے اس کی تشریح کرتے ہوئے بہت سی ایسی تفصیلات میں بھی جانا پڑا ہے جنہیں ایک شخص بادی النظر میں غیر ضروری قرار دے سکتا ہے۔ لیکن، جیسا کہ میں اپنی تقریر کے آغاز میں اشارہ کر چکا ہوں، میرے نزدیک یہ جماعت کی ایک تعلیمی ضرورت تھی جسے پورا کرنے کی میں نے کوشش کی ہے۔ جماعت میں اب ایسے لوگوں کی تعداد کم رہ گئی ہے جو اس تحریک کی ابتدا سے آج تک کے تمام مراحل سے خود گزرے ہیں اور ہر چیز کی "شانِ نزول" سے براہِ راست واقف ہیں۔ کثیر تعداد ایسے رفقاء کی ہے جو بیچ کے مختلف مراحل میں آئے ہیں اور پہلے کے مرحلے ان کے لیے صرف تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر آگے وہ لوگ آنے والے ہیں جن کے لیے یہ سب کچھ تاریخ ہو گا۔ ان کو یہ سمجھنے میں کہ آج تک مختلف مواقع پر ہم کیا کچھ کرتے رہے ہیں اور کیوں کرتے رہے ہیں، مشکلات پیش آسکتی ہیں، بلکہ فی الواقع پیش آرہی ہیں اور اچھی خاصی الجھنوں کی موجب بن رہی ہیں۔ یہ الجھنیں ان کے اطمینان ہی میں خلل انداز نہیں ہوتیں بلکہ اپنے مستقبل کا صحیح رخ متعین کرنے میں بھی ان کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہیں اور آگے اور زیادہ پیدا کریں گی۔ مجھ پر تمام دوسرے رفقاء سے بڑھ کر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ میں ان مشکلات کو رفع کرنے کی کوشش کروں۔ اس لیے کہ اس تحریک کے آغاز سے آج تک میں ہی اس کی رہنمائی کرتا رہا ہوں، اور ہر مرحلے میں ایک ایک قدم جو اٹھایا گیا ہے اس کی مصلحت اور ضرورت اور اس کے حالات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں نے اس کام کو اندھا دھند نہیں چلایا ہے بلکہ شب و روز کے غور و فکر کے بعد ایک ایک قدم خوب سوچ سمجھ کر اٹھاتا رہا ہوں۔ میرے ذمے جماعت کا یہ قرض تھا کہ پچھلے سارے کام کا پورا حساب کھول کر اس کے سامنے رکھ دوں۔ مگر اس قرض کو ادا کرنے کے لیے میں بار بار چھ چھ گھنٹے کی تقریریں نہیں کر سکتا تھا۔

اب پوری جماعت سامنے موجود ہے اور میں نے آپ کا قرض سب کے سامنے ادا کر دیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ جس مقصد کے لیے میں نے یہ محنت کی ہے وہ پورا ہو اور میری اس تقریر سے جماعت کے کارکنوں کو اپنی تحریک کے سمجھنے میں وہ مدد ملے جو اطمینان و بصیرت کے ساتھ کام کرنے کے لیے درکار ہے —— واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین